سے وابستہ نہیں کرتا بلکہ ایک حد تک سیاسی اور معاشی اصلاحات کیلئے روحانی اصلاح کو ضروری قرار دیتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ اسلام ایسے زمانہ میں معرض وجود میں آیا، جبکہ معاشی مسائل کی نوعیت موجودہ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے بہت کچھ مختلف تھی۔ عہدِ اسلام میں عربوں کی سوسائٹی پر نہ تو جاگیریت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اور نہ سرمایہ داری اور کمیونزم کا۔ جاگیری نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے زمینداروں کا ایک خاص طبقہ ہوتا ہے، اور کسانوں کی حیثیت نیم غلاموں کی سی ہوتی ہے۔ عرب میں یہ صورتِ حال نہ تھی، کیونکہ اس ملک کا بیشتر علاقہ ناقابل زراعت ہے۔ صرف یمن، طائف اور مدینہ میں زراعت اور کھیتی باڑی ہوتی تھی، مگر وہ بھی چھوٹے پیمانہ پر۔ اور تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان حصوں میں کوئی بڑا زمیندار طبقہ موجود تھا۔ بلکہ یہ دعویٰ کرنا بے جا نہ ہوگا، کہ زمینداری اپنی موجودہ ہیئت میں وہاں بالکل ناپید تھی۔ صرف طائف میں بنو عامر اور بنو ثقیف کے دو قبائل کے درمیان کھیتی باڑی کے مسئلہ پر طبقاتی کشمکش کا وجود تاریخ سے ثابت ہوتا ہے، مگر وہ بھی بہت ادنےٰ اور معمولی پیمانہ پر۔ مدینہ میں انصار کھیتی باڑی کا پیشہ کرتے تھے لیکن یہاں اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہؤا۔ کیونکہ تاریخ اس بارے میں ساکت ہے۔ یہی حال یمن کا تھا۔ بادیہ نشین عرب گلہ بانی اور لوٹ مار سے گزارہ حاصل کرتے تھے۔ اس لئے عرب کے بیشتر حصوں میں جہاں خانہ بدوشی کا دور دورہ تھا، زمین، جاگیر یا سرمایہ کے مسائل کا کیا ذکر ہو سکتا تھا، مکّہ کی سوسائٹی تاجروں کی سوسائٹی تھی اور قریشِ مکّہ کے تاجروں میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انھیں تاجرانہ سرگرمیوں کے باعث ان کو ایک ابتدائی نوعیت کا سیاسی نظام بھی تشکیل دینا پڑا، اور امنِ عامہ کا انتظام کرنے کے لئے حبشی سپاہیوں کا ایک دستہ بھرتی کرنا پڑا، جنھیں احابیش کہا جاتا تھا۔ ان حالات میں مکّہ کے معاشرہ کو کسی قدر معاشی اور طبقاتی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کی نوعیت وہ نہ تھی جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت معاشی کشمکش کی ہوتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام صنعتی نظام کی پیداوار ہے اور جس معاشرہ میں بڑے پیمانہ کی صنعتیں نہ موجود ہوں، اس پر سرمایہ دارانہ نظام کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اسلام کو موجودہ معاشی مسائل سے سابقہ نہیں پڑا۔ اس لئے اس کی تعلیمات کا جاگیرداریت، سرمایہ داری یا کمیونزم سے رشتہ جوڑنا درست نہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اسلام نے اپنے زمانہ کے معاشی مسائل حل نہیں کئے یا اس نے معاشی اصولوں کا خاکہ پیش نہیں کیا۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک معاشی مزاج ہے لیکن موجودہ حالات میں اس معاشی مزاج کے مطابق مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں مسائل حاضرہ اور عہدِ اسلام کے معاشی مسائل کے فرق کو نہ بھولنا چاہئے۔ جب تک یہ امر متعین نہ ہو جائے کہ اسلام نے کسی خاص صورتِ حال کے لئے کون سا معاشی حکم دیا تھا، اس وقت تک اسلام کے معاشی احکام کو موجودہ حالات پر چسپاں کرنا قرآن اور سنّت کی غلط ترجمانی کرنے کے مترادف ہوگا۔

ان امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس امر کا تصفیہ کرنا آسان ہوگا کہ اسلام اجتماعی ملکیت کا حامی ہے یا انفرادی ملکیت کا اس سلسلہ میں، قرآن اور حدیث، کا مسلک بالکل واضح ہے۔ قرآن کی کسی آیت سے اجتماعی ملکیت کے جواز کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ بعض آیات سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن انفرادی حق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ مثلاً:

للرجال نصیب مما اکتسبو، وللنساء نصیب مما اکتسبن۔

جو کچھ مرد کمائیں وہ ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتیں کمائیں وہ ان کا حصہ ہے۔

قرآن کا قانون وراثت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرہ انفرادی حق ملکیت پر قائم ہے بیشک قرآن میں ایسی آیات بھی ہیں، جیسے: الارض للّٰہ ساری زمین اللہ کے لئے ہے اور ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے اموال اور انکی جانیں خرید لی ہیں، تاکہ اس کے معاوضہ میں انہیں جنت عطا کرے۔ لیکن ان دونوں آیات سے اجتماعی ملکیت کا ثبوت نہیں ملتا، کیونکہ یہاں ملکیت یا عدم ملکیت کا سوال زیر بحث نہیں ہے پہلی آیت میں زمین سے مراد (EARTH) ہے نہ کہ (LAND) اس لئے اسے (LAND PROLELEM) کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔ دوسری آیت بھی سیاق وسباق کے لحاظ سے وہ معنے نہیں رکھتی جو اجتماعی ملکیت کے حامیوں نے اس سے اخذ کئے ہیں کیونکہ اس کا مقصود مسلمانوں کو جہاد نفس اور جہاد مال پر ابھارنا ہے نہ کہ ملکیت کے مسئلہ کو چھیڑنا۔۔۔۔۔ اس طرح قرآن وحدیث دونوں ملکیت کے انفرادی حق کو بنیادی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اسلام موجودہ نظام سرمایہ داری کی طرح انفرادی ملکیت کے حق کو لامحدود یا غیر مشروط طور پر تسلیم کرتا ہے۔ نظام سرمایہ داری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حق ملکیت کو دوسرے تمام حقوق پر مرجح قرار دیتا ہے اور اگر ملکیت کے غلط استعمال سے سوسائٹی میں فساد پیدا ہو، تب بھی وہ اس کو محدود یا منسوخ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اسلام میں کوئی حق غیر مشروط اور محدود نہیں۔ بلکہ اسلام کا دارومدار حدود کی پابندی پر ہے۔ تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فاولٰئک ھم الظالمون۔ (یہ اللہ کے حدود ہیں، جس نے ان حدود سے قدم آگے بڑھایا وہ ظالم ہے)۔ اس طرح ملکیت کا حق بھی حدود کے اندر آجاتا ہے بالفاظ دیگر انسان کا حق ملکیت انفاق کی شرط کے ساتھ محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا مسلمانوں کو انفاق پر اُبھارا۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ معاشیات میں قرآن کی بنیادی قدر انفاق ہی ہے۔ افسوس یہ ہے مسلمانوں نے انفاق کا ایک بہت ہی محدود اور تنگ تصور قائم کیا۔ جس کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں بیحد معاشی خرابیاں پیدا ہوگئیں سمجھا یہ جاتا ہے کہ انفاق کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی فقراء اور مساکین کی انفرادی طور پر خبر گیری کرے۔ اعزہ اور رشتہ داروں کی مدد کرے یا تعمیر مساجد اور اسی طرح کے رسمی کاموں پر روپیہ صرف کرے لیکن انفاق کے معنی اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ قومی تعمیری اور تعلیمی سرگرمیوں کے لئے اجتماعی اداروں کا قیام بھی انفاق کا ایک شعبہ ہے۔ اسی طرح بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں

سرمایہ لگانا بھی انفاق ہی کے تحت آتا ہے، جامعات علمی ادارے اور سائنسی ریسرچ کے مرکز قائم کرنا بھی انفاق کی ایک قسم ہے مختصر یہ کہ عامہ خلائق کی بھلائی کے لئے جتنا روپیہ صرف کیا جائے خواہ انفرادی طور سے یا اجتماعی طریق سے وہ انفاق کے حکم کی تعمیل ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ انفرادی طور پر روپیہ پیسہ صرف کرنیکا فائدہ اتنا ہمہ گیر اور دیرپا نہیں ہوتا جتنا اجتماعی طور پر قومی اور تعمیری کاموں میں روپیہ لگانے کا۔ اس لئے انفرادی طور پر حکم انفاق کی تعمیل کا وہ ثواب نہیں ہوگا جو اجتماعی کاموں میں حصّہ لینے کا کیونکہ اجتماعی اور تعمیری اداروں سے نہ صرف زیادہ انسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ان کا اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان سے دریوزہ گری کی ذہنیت بھی نہیں پیدا ہوتی، حالانکہ انفرادی طور پر خیر و خیرات کرنے یا اعزہ و اقربا کی مدد کرنے سے لوگوں کے اندر ایک خراب ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خود کام کرنے اور جد و جہد کرنے کے بجائے دوسروں کے سہارے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ غرضکہ سوسائٹی میں انفاق کی اسپرٹ موجود ہو تو انفرادی حق ملکیت سے بہت زیادہ فائدہ پہنچتا ہے لیکن جب یہ اسپرٹ جاتی رہے تو انفرادی حق ملکیت ایک عذاب بن جاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس حق ملکیت پر پابندیاں اور قیود عائد کئے جائیں اور اس طرح معاشی نظام کو اعتدال پر لایا جا سکے۔ لیکن یہ قیود اور پابندیاں عارضی ہونگی نہ کہ مستقل اور معاشی نظام کے اعتدال پر آتے ہی انھیں منسوخ کر دینا پڑیگا۔ قرآن کے نزدیک بہترین سوسائٹی وہ ہے جس میں دولت گردش کرتی رہے اور چند ہاتھوں میں مجتمع نہ ہو۔ کے لَا یَکُونَ دُولَۃً بَینَ الاَغنِیَاءِ مِنکُم (تاکہ دولت صرف دولتمندوں ہی میں گھوم پھر کر نہ رہ جائے)۔ دولت کی تقسیم کا مسئلہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے جسم میں خون کی گردش کا مسئلہ کہ اگر جسم کے ہر حصّہ کو اتنا خون نہ ملے جتنا اسے درکار ہے، بلکہ سارے جسم کا خون کسی ایک حصّہ میں مجتمع اور مرتکز ہو جائے تو انسانی جسم ناکارہ ہو جائیگا۔ اسی طرح وہ سوسائٹی بھی ناکارہ ہو جائے گی جس میں دولت کی تقسیم اس طرح عمل آئے، کہ ایک محدود طبقہ کے پاس تو لاکھوں کروڑوں روپیہ ہو، اور باقی طبقے افلاس و ناداری یا معاشی تکالیف کا شکار ہو جائیں۔

علاوہ ازیں انفرادی حق ملکیت کو اسلام نے زکوٰۃ کے قیام کے ساتھ مشروط کیا تھا جس سوسائٹی میں زکوٰۃ کا کوئی باقاعدہ نظام نہ ہو اور قوم کے معذور و مجبور اور بدحال افراد کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے، اس کے اندر انفرادی حق ملکیت کا استعمال عظیم ترین معاشی خرابیوں کا موجب بن جاتا ہے۔ ہماری موجودہ سوسائٹی اسی مصیبت میں مبتلا ہے، کیونکہ اس میں اجتماعی طور پر زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا کوئی انتظام نہیں۔ ہمارے یہاں معذور و مجبور افراد، بوڑھے اور بیوائیں غریب نادار اور بے روزگار لوگ یا تو فقر و فاقہ میں زندگی گزارتے ہیں یا انھیں خیرات کے سہارے پر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک کمانے والا ہوتا ہے تو دس کھانے والے اور اکثر افراد کو اپنے اہل و عیال کے علاوہ پریشان حال اعزہ اور اقربا کی مدد کرنی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ نہ تو وہ خود اطمینان کی روٹی کھا سکتے ہیں اور نہ دوسروں کی کماحقہٗ امداد کر سکتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا کوئی باقاعدہ نظام موجود ہوتا، تو یہ صورت نہ پیدا ہوتی۔ حالانکہ اجکل

ہر ترقی یافتہ قوم میں زکوٰۃ کا نظام موجود ہے اور کوئی ریاست ایسی نہیں جس نے (WELFARE STATE) کو اپنا نصب العین نہ قرار دیا ہو۔ حالانکہ اسلام نے دنیا میں پہلی (WELFARE STATE) قائم کی تھی اور اس امر کا ذمہ لیا تھا کہ اس کے علاقہ میں کوئی فرد بشر بھوکا ننگا نہ رہیگا خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ البتہ اسلامی عہد میں چونکہ حکومت کے وسائل آمدنی محدود تھے اس لئے زکوٰۃ کا اسلامی نظام بھی محدود تھا آجکل کے زمانہ میں جن ملکوں نے (SOCIAL SECURITY) کا نظام قائم کیا ہے وہ بہت زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ اس میں اسلام کی کوئی خطا نہیں کیونکہ اس کے زمانہ میں انسان کی قوتِ پیداوار بہت کم تھی۔ نہ مشینری کا کوئی وجود تھا اور نہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کا، نہ ہی آمد و رفت کی وہ سہولتیں اور مواصلات کا وہ ترقی یافتہ نظام موجود تھا جس سے آج کی دنیا مستفید ہو رہی ہے، اس کے باوجود اسلام نے اپنے معاشرے کی مجبوریوں اور پسماندگیوں کے مدِنظر (SOCIAL SECURITY) کا جو نظام قائم کیا وہ اس کا ایسا شاندار کارنامہ تھا جس کی ہمعصر تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن اس نظام کو ہم موجودہ حکومتوں اور سلطنتوں کے نظام کے مقابلہ میں نہیں پیش کر سکتے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اصول زکوٰۃ کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اس کے قواعد و ضوابط میں موجودہ حالات کے لحاظ سے ترمیم کریں۔ کیونکہ اسلام نے زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے جو قاعدے وضع کئے تھے وہ اپنے معاشرے کے حالات کو دیکھ کر کئے تھے لیکن اب حالات بالکل مختلف ہیں۔ اسلئے زکوٰۃ کے سابقہ قواعد پر اڑے رہنے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ اس زمانہ میں گھوڑوں، بکریوں، اونٹوں وغیرہ پر زکوٰۃ لگانا یا اناج کی پیداوار پر عشر لگانے سے وہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا جو اسلام کے پیشِ نظر تھا۔ آج کا نظام زکوٰۃ عہدِ اسلام کے نظام سے بہت کچھ مختلف ہوگا لیکن اس کا مقصد و منتہا وہی ہوگا جو زمانہ اسلام میں تھا۔ یعنی یہ کہ سوسائٹی کی معاشی اونچ نیچ کو اعتدال پر لایا جائے۔ لوگوں کو افلاس اور ناداری سے محفوظ رکھا جائے۔ نیز ان کے اندر دریوزہ گری کی ذہنیت نہ پیدا ہونے پائے بلکہ ان کی امداد اس طور پر کی جائے کہ وہ ذاتی جدوجہد کے ذریعے خود کفیل ہو جائیں۔

جہاں تک زمین کی ملکیت کے مسئلہ کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ بنیادی طور پر انفرادی حقِ ملکیت تسلیم کیا جائے لیکن اراضی کی ازسرنو تقسیم اس طرح عمل میں آئے کہ کسانوں کی بیشتر آبادی اپنی زمین کی خود مالک ہو اور براہِ راست حکومت سے معاملت کرے۔ اراضی کا موجودہ نظام، معاشی حیثیت سے اسقدر غیر منصفانہ ہے کہ اس پر لامحدود حقِ ملکیت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلامی تعلیم کی رو سے ہر حق محدود اور مشروط ہوتا ہے۔ اور جب کسی حق کے استعمال سے سوسائٹی میں وسیع پیمانہ پر ظلم و ناانصافی کا دور دورہ ہو تو اس کو محدود اور معطل کیا جا سکتا ہے۔

محمد جعفر شاہ پھلواروی

قرآن اور جمالیات

سب سے پہلے ہمیں کائناتِ فطرت پر غور کرنا چاہیئے جس میں ہر جاندار کے لئے قدرت نے بے شمار سامانِ فرحت و سرور پیدا کئے ہیں۔ یہ شگفتگی و مسرت انسانی زندگی کا ایک بڑا اہم حصہ ہے، بشرطیکہ اس کا ربط دوسرے اجزائے حیات سے توازن کے ساتھ قائم رہے۔ انسان اپنی بقا کے لئے جس طرح مادی اسباب کا محتاج ہے اسی طرح کچھ روحانی مسرتیں بھی ہیں جن کا انسان محتاج ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ اندرونی تقاضا اتنا زبردست ہوتا ہے کہ مادی تقاضے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

مادی اور روحانی تقاضوں میں وہی فرق ہے جو قانون اور اخلاقی اقدار میں ہے۔ قانون مادی زندگی کے کچھ گوشوں کو پُر کر سکتا ہے، لیکن خود قانون بالکل بیجان اور بے معنی ہوتا ہے اگر اس کی بنیاد اخلاقی قدروں پر نہ ہو، اخلاقی اقدار اور ذوقِ سلیم دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے نام ہیں اور مادہ و قانون کا اصل مقصد اسی حقیقت کی طرف آگے بڑھانا ہوتا ہے۔

مادیت اور روحانیت اگرچہ بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں لیکن انسان کو دونوں کا جامع بنایا گیا ہے، یہ اپنی اصل حقیقت میں صرف ایک "انا" (EGO) ہے، ایک لطافت ہے، اور ایک انرجی ہے جسے قرنہا قرن کے ارتقائی ادوار سے گذار کر ایک مادی لباس پہنا دیا گیا ہے، مادہ پرست اپنی اسی مادیت کو اصل حقیقت سمجھتا ہے اور اسی میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور اس کے برعکس رہبانیت پسند اس مادیت کو روحانیت کی ضد سمجھ کر اس سے اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے اور نہیں چھڑا سکتا۔

لیکن دینِ انبیاء ——— اسلام ——— اس تناقض کو دور کر کے ان دونوں کا ایک حسین امتزاج پیدا کرتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ اسی مادیت میں رہ کر اور اسی سے گذرتے ہوئے اُس اصل حقیقت کو تلاش کرتے رہو جو اس مادیت کے پسِ پردہ کارفرما ہے۔ یہ ایک ایسا اندازِ فکر اور طرزِ عمل ہے جو نہ مادیت کو ختم کرتا ہے نہ روحانیت کو فنا کرتا ہے، بلکہ یہاں دونوں ایک دوسرے کی معاون ہو جاتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو ارتقا کی طرف لے جاتی ہیں۔ اسلام نہ تو نری مادیت کا قائل ہے نہ نری روحانیت کا۔ اس کے نزدیک روحانیت اسی مادیت کو اعتدال اور سواء الصراط پر لانے کے لئے ہے اور مادیت اسی روحانیت کو تلاش کرنے کا واحد راستہ ہے۔ نری روحانیت کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ: "ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ماکتبنا ھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا" (یہ رہبانیت جو انھوں نے خود اختراع کر لی ہے ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی بجز اس کے کہ وہ رضائے الٰہی طلب کریں مگر وہ صحیح رعایت نہ کر سکے) اور نری مادیت کے بارے میں اسلامی زاویۂ نظر یہ ہے کہ: "اولٰئک کالانعام بل ھم اضل" (یہ لوگ چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں)۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے، کہ اسلام مادی اور روحانی دونوں تقاضوں کو پورا کرنے کا

رجحان رکھتا ہے لیکن اس کا انداز یہ ہے کہ دونوں کے امتزاج میں توازن ہو، تناسب ہو، اعتدال ہو اور حسن و جمال ہو، ہر تقاضے پر اسلام نے کچھ قیود و حدود لگا دی ہیں۔ اور کچھ قدغنیں بٹھا دی ہیں تاکہ روح و مادہ کے اس امتزاج میں لطافت باقی رہے، بگاڑ نہ پیدا ہو۔ اسی لطافت کا نام حسن و جمال ہے اور بگاڑ اس کی ضد ہے۔

اسلام کو اگر جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھئے، تو معلوم ہوگا کہ وہ روحانی اور مادّی ہر دو تقاضوں کی تکمیل میں حسن و جمال کو پسند کرتا ہے، یا یوں کہئے کہ دونوں کے امتزاج میں بھی وہی طریقہ پسند کرتا ہے، جو حسین تر ہو، لہٰذا .... پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام جمال پسندی کے متعلق کیا زاویۂ نظر رکھتا ہے۔

قرآن پاک کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی جمال پسندی میں قطعاً کوئی شبہ نہیں باقی رہتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس پسند کو کئی طرح سے ظاہر فرماتا ہے:-

لفظ حُسن اور اس کے مشتقات سے
لفظ جمال اور اس کے مشتقات سے
لفظ زینۃ اور اس کے مشتقات سے

دوسرے اندازِ بیان سے

آیئے ان سب پر ایک اجمالی نگاہ ڈال لیں، ہم نے قرآن مجید کا مطالعہ جب اسی نقطۂ نگاہ سے کیا تو کم و بیش تین سو آیتیں ملیں جن کا تعلق جمالیات سے ہے، اس پر تعجب نہ کیجئے، ایک درخت کو اگر آپ صرف رنگ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو جڑ سے پھننگ تک آپ کو رنگ ہی رنگ نظر آئینگے، قوتِ نمو، قوتِ تحلیل، قوتِ جذب، اندازِ ربوبیت، خواص، قوتِ شعور وغیرہ میں جس زاویۂ نظر سے بھی آپ کسی درخت کو دیکھیں گے، وہ سر سے پاؤں تک وہی نظر آئیگا۔ یہی حال اس شجرۂ طیبہ ـــــ قرآن پاک ـــــ کا ہے اسے جس نقطۂ نگاہ سے آپ دیکھیں گے، آپ کو یہ ویسا ہی دکھائی دیگا۔ کیونکہ یہ ساری خوبیوں کا نمائندہ اور مجموعۂ شکل و مدت ہے۔

قرآن مجید کی ساری آیتوں کو پیش کرنا یقیناً موجب طوالت ہوگا، اسلئے ہم صرف چند ہی آیات پیش کرینگے، ملاحظہ ہو:-

آسمانوں کے ذکر میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنیَا بِزِینَۃِ الکَوَاکِب ... (۳۷:۶)

ہم نے سماء دنیا کو کواکب کی زینت سے مزین کیا ہے۔

وَلَقَد زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنیَا بِمَصَابِیح .... (۶۷:۵ دائم)

ہم نے سماء دنیا کو روشن چراغوں سے زینت بخشی ہے۔

وَجَعَلنَا فِی السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَیَّنّٰھَا لِلنّٰظِرِین، (۱۵:۱۶)

ہم نے آسمان میں برج بنائے اور دیکھنے والوں کیلئے اسے مزین کیا۔

أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا ۔۔۔۔ (۵۰ : ۶)

تو کیا لوگ اپنے اوپر آسمان کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور اسے زینت بخشی ہے؟

نباتات کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے :-

حتّٰی اذا اخذت الارض زخرفها وازّينت ۔۔۔۔ (۱۰ : ۲۴)

یہاں تک کہ جب زمین اپنے کمال حسن کو اختیار کرکے مزین ہو گئی ۔

نباتات کے علاوہ سطح زمین کی تمام مخلوقات کے متعلق ارشاد ہے :-

اِنا جعلنا ما على الارض زينةً لها ۔۔۔۔ (۱۸ : ۷)

ہم نے جو کچھ بھی زمین پر بنایا ہے وہ اس کی زینت کیلئے ہے ۔

لباس کو زینت اور زینتُ اللہ (اللہ کی زینت) فرمایا گیا :-

یٰبنی آدم خذوا زینتکم عند کلّ مسجد ۔۔۔۔ (۷ : ۳۱)

اے فرزندانِ آدم ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کر لیا کرو (اس میں لباس اور سلیقہ مندی کی سب باتیں داخل ہیں)

قل من حرّم زينة الله التي اخرج لعباده ۔۔ (۷ : ۳۲)

پوچھو کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو زینت کی چیزیں پیدا کی ہیں انکو کس نے حرام کیا ہے

یٰبنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم وریشا ۔۔۔۔

اے فرزندانِ آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس مہیا کیا جو تمہاری پردہ پوشی کرتا ہے اور باعثِ زینت ہے ۔

انعام (چوپایوں) کا ذکر کرتے ہوئے جہاں اس کے مختلف مقاصد بتائے ہیں وہاں ایک مقصد یہ بھی ہے :-

ولكم فيها جمال حين تريحون وحين تسرحون (۱۶ : ۶)

تمہارے لئے انکے اندر شام کو لوٹاتے وقت اور صبح کو بھیجتے وقت ایک عجیب جمال ہوتا ہے ۔

گھوڑے، خچّر اور گدھے کا مقصد سواری کے علاوہ اور بھی ہے :-

والخيل والبغال والحمير لتركبوها وزينة ۔۔۔ (۱۶ : ۸)

اس نے گھوڑے، خچّر اور گدھے سواری کیلئے بھی بنائے ہیں اور زینت کیلئے بھی ۔

بنی اسرائیل کو جو بقرہ ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس میں جمالیات کا زیادہ لحاظ رکھا گیا تھا :-

انها بقرة صفراء فاقع لونها تسرّ الناظرين ، (۲ : ۶۹)

ایسی گائے جو بھڑک دار زرد ہو اور دیکھنے والوں کو بھی بھلی لگے ۔

۔۔۔ لاشية فيها (۲ : ۷۱) اس میں کوئی داغ دھبا نہ ہو ۔

خدا اپنی تمام مخلوقات کے متعلق فرماتا ہے :-

الذی احسن کل شئ خلقه (۳۲ : ۷) جس نے اپنی ہر پیدا کردہ شئے کو حسن بخشا۔

انسان کی صورت گری کی کیفیت کے متعلق ارشاد ہے :

وصورکم فاحسن صورکم (۴۰ : ۶۴ و ۶۴ : ۳) تمہاری صورت گری کی تو حسین صورتیں بخشیں۔

آخری ٹھکانے کے متعلق ارشاد ہے :-

والله عنده حسن المآب (۳/۱۴، ۱۳/۲۹، ۳۸/۲۴، ۳۸/۴۹) اللہ کے ہاں جو ٹھکانا ہے اس میں بھی حسن ہے۔

یہی اجر و ثواب کے متعلق ہے :-

والله عنده حسن الثواب (۳/۱۹۵) اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ بھی حسن رکھتا ہے۔

خوب کاروں کی جو جزا ہے اس کے متعلق لفظ حسنہ آیا ہے :-

للذین احسنوا فی هذه الدنیا حسنة... (۱۶/۳۰) اس دنیا میں حسن کاروں کیلئے حسین بدلہ ہے۔

وعظ و پند کا حکم دیتے وقت حسن کاری کا لحاظ ضروری ہے :-

ادع الی سبیل ربك ...... راہ ربانی کی طرف دعوت دو ....

والموعظة الحسنة (۱۶ : ۱۲۵) حسین وعظ و پند کے ساتھ

اسی جگہ مناظرے کے لئے جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ یہ ہے :-

وجادلهم بالتی هی احسن (۱۶ : ۱۲۵) انکے ساتھ مباحثہ کرنا ہو تو خوبصورت ترین طریقہ اختیار کرنا

حسن عمل کی جزا دس گنی رکھی گئی ہے :-

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها... (۶/۱۶۰) جو خوب کاری کریگا اسے دس گنا بدلہ ملے گا۔

دعائیہ الفاظ میں دنیا اور آخرت دونوں کیلئے حسن عمل کی توفیق مانگنی سکھائی گئی ہے :-

.... ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و اے ہمارے رب ہمیں دنیا اور آخرت دونوں

فی الآخرة حسنة (۲ : ۲۰۱) میں "حسنہ" عطا فرمایا۔

حسنہ ہی کے عوض کئی گنا بدلہ اور اجر عظیم کا وعدہ ہے :-

.... وان تك حسنة یضعفها ویوت اگر رائی برابر بھی حسنہ ہو گا تو اللہ اس کو کئی گنا کریگا

من لدنه اجرا عظیما (۴ : ۴۰) اور اپنی بارگاہ خاص سے اجر عظیم عطا فرمائیگا۔

حسین سفارش کے متعلق ارشاد ہے :-

من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها (۴ : ۸۵) جو خوبصورت سفارش کریگا اس کیلئے اس میں حصہ ہو گا۔

حسن عمل برائیوں کو دُور کر دیتا ہے :-

ان الحسنٰت یذھبن السیّاٰت ۔ ۔ ۔ (۱۱/۱۱۴) حُسن کاریاں بدکاریوں کو دُور کر دیتی ہیں -

اللہ اپنے قبول اور مریمؑ کی اٹھان کے متعلق فرماتا ہے :-

فتقبّلھا ربّھا بقبولٍ حسَنٍ و انبتہا نباتاً حسَنًا ۔ ۔ ۔ ۔ (۳ : ۳۷) اللہ نے اسے حسن قبول سے نوازا اور اس کی عمدہ اُٹھان اُٹھائی -

راہِ مولیٰ میں جو کچھ دیا جائے وہ قرض ہے مگر کیسا قرض ؟ ارشاد ہے :-

من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسَنًا ۔ ۔ کون ہے جو خدا کو حسین قرض دے ؟

۔ ۔ ۔ (۲/۲۴۵ ، ۵/۱۲ ، ۵۷/۱۱ ، ۵۷/۱۸ ، ۶۴/۱۷ ، ۷۳/۲۰)

خدا اپنی جنگی آزمائشوں کے لئے جو عجیب لفظ پسند فرماتا ہے وہ یہ ہے :-

ولیبلی المومنین منہ بلاءً حسنًا ۔ ۔ (۸:۱۷) تاکہ وہ اہلِ ایمان کو جنگ کی حسین آزمائش میں ڈالے -

اپنی متاع بخشیدہ کو بھی خدا متاع حسَن کہتا ہے :-

۔ ۔ ۔ یمتعکم متاعًا حسَنًا ۔ ۔ ۔ (۱۱:۳) - وہ تمہیں حسین متاع سے نوازیگا -

حضرت شعیبؑ رزقِ الٰہی کو بھی حسین رزق کہتے ہیں :-

۔ ۔ ۔ ۔ رزقنا منہ رزقًا حسنًا ۔ ۔ ۔ (۱۱:۸۸) اس نے اپنی طرف سے حسین روزی دی -

اللہ بھی اپنے رزق کو ایسا ہی فرماتا ہے :-

ومن رزقنٰہ رزقًا حسنًا ۔ ۔ ۔ (۱۶/۷۵ ، ۱۶/۶۷ ، ۲۲/۵۸) اور جسے ہم نے حسین روزی دی -

ایمان و عمل صالح کے عوض خدا جس اجر کا وعدہ فرماتا ہے وہ نرا اجر نہیں بلکہ :

(الف) ان لھم اجرًا حسَنًا ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۸ : ۲) ان کے لئے حسین اجر ہے -

(ب) ۔ ۔ ۔ یؤتکم اللہ اجرًا حسنًا ۔ ۔ ۔ (۴۸ : ۱۶) تمہیں خدا حسین بدلہ دے گا -

سیدنا موسیٰ وعدۂ الٰہی کو بھی محض وعدہ نہیں فرماتے بلکہ :-

۔ ۔ ۔ ۔ الم یعدکم ربکم وعدًا حسَنًا ۔ ۔ ۔ (۲۰ : ۸۶) کیا تمہارے ربّ نے تم سے حسین وعدہ نہیں کیا ہے ؟

خدا بھی اپنے وعدے کو ایسا ہی فرماتا ہے :-

افمن وعدنٰہ وعدًا حسنًا ۔ ۔ ۔ (۲۸ : ۶۱) کیا وہ جس سے ہم نے حسین وعدہ کر رکھا ہو ۔ ۔

اللہ اپنے ناموں کو بھی حسین نام کہتا ہے :-

وللہ الاسماء الحسنٰی ۔ ۔ ۔ (۷/۱۸۰ ، ۲۰/۸ ، ۱۷/۱۱۰ ، ۵۹/۲۴) اور اللہ ہی کے لئے ہیں حسین نام -

آگے چلنے سے پہلے ایک ضروری حقیقت پر بھی غور کرتے چلئے "حُسن" سے تعلق رکھنے والے بیشمار الفاظِ قرآنی کو ہم نے اگرچہ بخوفِ طوالت ترک کر دیا ہے لیکن ایک لفظ کا ذکر کر دینا یہاں بہت ضروری ہے وہ ہے لفظ "احسان" اور اسکے مشتقات۔ اس لفظ کے مشتقات بہت ہیں جو قرآن میں آئے ہیں مثلاً: احسن، احسنوا، احسنتم، یحسنون، محسنین وغیرہ، ہم ان سب کو اس وقت چھوڑتے ہیں، البتہ اس کے معنی ضرور سمجھ لینا چاہیئے۔ احسان کا ترجمہ عام طور پر "نیکی" کیا جاتا ہے، یہ ترجمہ بہت محدود اور تنگ ہے، اسکے لغوی معنے ہیں حسین کر دینا یا حسین بنا دینا۔ جو کام بھی عمدگی، خوبصورتی، سلیقے اور خوبی کے ساتھ کیا جائیگا وہ اس کام کا احسان ہوگا۔ جس بات میں حسن و خوبی پیدا کی جائے وہ احسان ہوگا۔ مطلوب صرف نیکی نہیں بلکہ اس میں حُسن پیدا کرنا ہے۔ ایک ہے نیت اور ایک ہے حُسنِ نیت، ایک ہے عمل اور ایک ہے حُسنِ عمل، ایک ہے خُلق اور ایک ہے حُسنِ خُلق، ایک کلام ہے اور ایک حُسنِ کلام، ایک ہے بیان اور ایک ہے حُسنِ بیان، ایک ہے ظن اور ایک حُسنِ ظن، ایک ثواب ہے اور ایک ہے حُسنِ ثواب، ایک ہے عبادت اور ایک حُسنِ عبادت؛ —— ان دونوں میں فرق ہے، ایک چیز نیکی ہے اور دوسری حُسنِ نیکی ہے۔ یہی مطلوب ہے اور اسی کی ایک نوعیت احادیث میں (بطور تشریح احسان) یوں بیان کی گئی ہے کہ ان تعبد الله کانك تراه فان لم تکن تراه فانه یراك (عبادتِ الٰہی اس حُسن و خوبی سے کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو ورنہ کم از کم یہ تصور تو ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) —— گویا صرف عبادت مطلوب نہیں بلکہ اس میں کمالِ حسن پیدا کرنا مطلوب ہے۔ اس لحاظ سے قرآن پاک میں جہاں جہاں بھی احسان کا لفظ آیا ہے اس سے مراد زندگی اور اس کے اعمال میں حسن و جمال، عمدگی، سلیقہ، خوبی اور زینت پیدا کرنا ہی مقصود ہے اور مُحسن وہی ہے جو اپنے افکار، گفتار اور کردار سب میں حُسن پیدا کرنے کی فکر میں لگا ہے۔ اس احسان کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ ان تمام آیتوں سے ہو سکتا ہے جن میں مُحسنین کی محبوبیت یا معیت کا ذکر ہے مثلاً: ان الله یحب المحسنین، ان الله مع المحسنین وغیرہ۔

لفظ زینت اور حُسن کے بعد لفظ جمال اور اس کے مشتقات کو بھی دیکھتے چلئے، ایک آیت تو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ:

ولکم فیھا جمال حین تریحون و حین تسرحون (۱۶ : ۶) — اور ان چوپایوں میں تمہارے لئے عجیب جمال ہے شام کو لوٹاتے وقت اور دن کو باہر لے جاتے وقت۔

اس کے بعد کچھ اور آیات بھی دیکھئے:۔ عورتوں کو الگ کرنا ہو تو اس کے لئے یہ حکم ہے:۔

... فمتعوھن وسرحوھن سراحا جمیلاً۔ (۳۳ : ۴۹) انہیں کچھ دے دو اور عمدگی سے چھوڑ دو۔

یہی مضمون دوسری جگہ لفظ احسان کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:۔

فامساك بمعروف او تسریح باحسان | انھیں قاعدے سے روک لو یا خوبصورتی سے چھوڑ دو۔

دشمنوں اور مخالفوں سے درگذر کرنے کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے:۔

... واھجرھم ھجرا جمیلاً۔ (۷۳ : ۱۰) | انھیں عمدگی سے ان کے حال پر چھوڑ دو۔